عطش درانی

اسلامی فلسفے کے متعلق چند مغالطوں کا ازالہ

عام طور پر اسلامی فلسفے کے نام سے جو کتابیں بازار میں آ رہی ہیں وہ دراصل مسلم مذہبی فکر کا احاطہ کیے ہوتے ہوتی ہیں، ان میں زیادہ تر الٰہیات اور تصوف کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ ہر وہ کام جو مسلمانوں نے کیا اسے مسلم یا مسلمانوں کا کام تو کہا جاتا ہے لیکن اسلامی فلسفے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ صاف ظاہر ہے کہ اسلامی فلسفہ صرف وہ ہو گا جو اسلام نے دیا اور اس میں جتنی فروعات، اضافے اور انحرافات کیے گئے انھیں ہم اسلامی فلسفے کا نام نہیں دے سکتے۔ رہی مسلم فکر کی بات تو اس میں علم الکلام (عقلیت پسند) علم الکلام (اسناد پسند)، تصوف، اشراقی فلسفہ اور مشائی فلسفہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اشراقی اور مشائی فلسفے کا مطالعہ عام طور پر پیش نہیں کیا جاتا۔ جدید دور میں سید حسین نصر (ایران میں) اس موضوع کو سامنے لا رہے ہیں، لیکن اسماعیلی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے کے باعث ان کا رجحان باطنیت کی طرف زیادہ ہے اور یوں وہ دیگر مکاتبِ فکر کا احاطہ کرنے میں غیر جانب دار نہیں ہو پائے۔

برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ مسلم فلسفہ تخلیقی فکر کے طور پر اہم نہیں۔ گویا صحرا نشین عرب کسی باقاعدہ فکری روایت سے محروم تھے۔ یہ نقطۂ نظر ایک بہت بڑے مغالطے کا باعث بن رہا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام سرے سے کوئی ثقافت اور فلسفہ نہیں رکھتا، بلکہ یوں کہیے کہ اسلام ایک غیر مہذب قوم کا دین ہے۔ اب اس مغالطے کو دور ہو جانا چاہیے اور مستشرقین کے باطلانہ پروپیگنڈے کا احتساب کرنا چاہیے۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام کے عہدِ زریں میں مسلمان مفکرین نے دیگر اقوام کے دانش وروں کو اسلامی فکر سے متعارف کرانے کے لیے خود ان کی اصطلاحوں میں افکار مرتب کیے، اس طرح سے مسلم فلسفہ ظہور پذیر ہوا۔ اس کے پیش کار ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ہیں۔ اس نظریے کے بارے میں ہمارے چند اہلِ قلم مستشرقین اور اسلامی مناہج کی تحریک کے پیشِ نظر اسے پیش کرتے ہیں، وہ اسے جامد نظریہ گردانتے ہیں۔ [illegible] مفکرین نے پیش کیا ہے۔ تبلیغ

اور تشریح کے لیے فلسفیانہ اصطلاحوں کا سہارا لینا کسی بھی طور پر جارحانہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن حکیم میں دانش و حکمت کے موتی ملتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔

بعض اہلِ نظر کے نزدیک مسلم فلسفہ بنیادی طور پر یونانی فلسفے سے ماخوذ ہے۔ ان کے نزدیک یونانی تہذیب کا بنیادی مسئلہ تجربی اور تعقلی علم میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے فکری حلقوں میں اس مسئلے کو کبھی اہمیت حاصل نہیں رہی اور یہ کہ مسلمانوں کا اساسی فکری مسئلہ وحی اور عقل کے حاصلات میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا اور یہ دونوں مسائل بہ اعتبار ماہیت ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ یہ بھی اتنا ہی بڑا مغالطہ ہے جیسا کہ پہلے بیان کیے گئے شر انگیز مغالطے ہیں۔

بعض دشمنانِ اسلام نے مسلم فلسفے کے بارے میں مغالطہ آرائیوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور ہمارے بعض سادہ لوح یا انتہائی پرفریب اہل قلم بھی ان کی تقلیدِ محض کو اپنا وتیرہ بنائے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی پہلی صدی میں عجمیت (جس میں مجوسیت شامل تھی) مسلم فکر میں شامل ہوئی۔ تصوف بھی اسی دور میں عرب کے لیے ایران کا تحفہ بن کر وارد ہوا۔ دوسری صدی ہجری میں یہ یونانی فلسفہ نہیں تھا جو بنیادی طور پر مسلمانوں نے حاصل کیا بلکہ عیسائیت کا دیا ہوا نو فلاطونی علم الکلام اور اس کے ردعمل کے طور پر نسطوری علم الکلام تھا، جو جندے شاپور اور حران کی اکادمیوں سے عباسی سلطنت میں در آیا۔ عیسائی علما اسی کو یونانی فلسفہ کہتے تھے۔ حالاں کہ یہ اسناد پسند اور عقلیت پسند علم الکلام تھا جو یونانی فلسفے کی اصطلاحوں میں بیان ہوتا تھا۔ مسلمانوں نے ابتدا میں اسے یونانی فلسفہ ہی سمجھا، مگر رفتہ رفتہ ان پر یہ بات کھلی کہ یہ تو عیسائیت کو فلسفے کے چوکھٹے میں فٹ کرنے کی کوشش تھی۔ چنانچہ اس عیسائی الہیات کا توڑ کرنے کے لیے سیدھے سادے اعتقادی مذہب اسلام کے پیروکاروں کو بھی فلسفے کی اصطلاحوں میں بات کرنا پڑی۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے اس عیسائی علم الکلام کا جواب فلسفے کی اصطلاحوں میں دیا، انھیں ہم معتزلہ کہتے ہیں۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات اور عقائد کو فلسفے کا روپ دیا اور بجا طور پر ہم انھیں اسلامی فلسفے کا بانی قرار دے سکتے ہیں۔

معتزلہ اپنے فلسفیانہ ہتھیاروں سے عیسائی علما کے اٹھائے ہوئے سوالوں کی بھرمار کا جواب دے کر اسلام کا دفاع کرنے میں تو کامیاب رہے لیکن جب انھوں نے خلیفہ کے ذریعے اپنے عقائد کی

تبلیغ جب شروع کی اور علما پر سختیوں کے سلسلے کا آغاز ہوا تو اُن کے ردعمل کے طور پر اشاعرہ اور سلفیہ کے مکاتبِ فکر پیدا ہوئے۔ اشاعرہ کا اختتام تو امام غزالی پر ہوا لیکن سلفیہ جس کا آغاز امام احمد بن حنبل سے ہوا، آگے چلتا رہا۔ امام ابن تیمیہ اور امام محمد بن عبدالوہاب سے لے کر آج تک اس کا دور دورہ ہے۔ اشاعرہ اسناد پسند متکلمین کا گروہ تھے لیکن سلفیہ محض اعتقادی مسلک بن کر رہ گیا۔

رہی یونانی تہذیب کی بات تو اب اس مغالطے کا ازالہ ہو جانا چاہیے کہ اس کا بنیادی مسئلہ تجربی اور تعقلی علم میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ یہ بات دراصل یونانیوں کی بے جا توصیف اور ان سے مرعوبیت کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تجربی علم سرے سے یونانی طریق کا نتیجہ ہی نہ تھا اور نہ انھیں تجربی علم سے دلچسپی تھی۔ پوری تاریخ میں ہمیں یونانیوں کے ہاں صرف دو تجربات ملتے ہیں۔ ایک تو فیثاغورس نے تار کی تھرتھراہٹ کا اس کے طول سے تعلق معلوم کیا تھا اور دوسرے ارشمیدس نے اشیا کی کثافتِ اضافی دریافت کی تھی اور ان دونوں کا تعلق یونان کے عہدِ زریں سے نہ تھا، دراصل تجربات کرنا یونانیوں کے مزاج کے خلاف تھا، وہ صرف استدلال کی عیاشی میں مبتلا تھے۔ ارسطو جیسا عالم فاضل شخص بھی تجربات سے دور بھاگتا تھا، اس نے طبیعیات تو لکھ دی تھی لیکن تجربہ ایک بھی نہ کیا۔ صاف ظاہر ہے کہ تجربی اور تعقلی علم کا جھگڑا یونانیوں نے سرے سے اٹھایا ہی نہیں۔

یونانیوں کے بعد اہلِ روما آئے۔ ارشمیدس اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اہلِ روم بنیادی طور پر افادیت پسند تھے۔ انھوں نے فلسفہ اور سائنس کو صرف ٹیکنالوجی کے لیے استعمال کیا، اس لیے یہ ان کا بھی مسئلہ نہ تھا۔

تجربی کا باقاعدہ آغاز صرف اور صرف مسلمانوں نے کیا۔ جابر بن حیان اور یعقوب الکندی اس کے بانی تھے اور سائنٹیفک طریق جسے بیکنی طریق کہا جاتا ہے، دراصل مسلمانوں نے پیش کیا تھا۔ ابوالبرکات البغدادی کا نام اس ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ بھی غلط ہے کہ مسلمانوں کا اساسی مسئلہ وحی اور عقل کے حاصلات میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ بلکہ مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ اسلام پر دیگر مذاہب اور فلسفیوں کی یلغار کا مقابلہ کرنا تھا۔ چنانچہ کہیں تو انھوں نے دیگر مذاہب کو سرے سے رد کر دیا، کہیں انھیں منسخ شدہ ادیان قرار دیا اور کہیں وحدتِ ادیان کے نظریے کے تحت بعض فرقوں نے ان ادیان خصوصاً مجوسیت اور

عیسائیت کی اسلام کے ساتھ تطبیق یا امتزاج کی کوشش کی۔

عقل اور وحی کی جنگ کو ہم مسلمانوں کا مسئلہ قرار دے ہی نہیں سکتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایسا مذہب ہے ہی نہیں جو عقل سے متحارب ہوتا ہو بلکہ قرآن مجید میں صاف طور سے کہہ دیا گیا ہے کہ "وحی کی تفصیلات ان لوگوں کو بتائی جاتی ہیں، جو علم رکھتے ہیں"۔ قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر و تعقل کے بارے میں سات سو آیات ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ جھگڑا موجود تھا تو پھر دوسری صدی ہجری ہی میں کیوں اٹھا؟ کیا پہلی صدی کے لوگ زیادہ عاقل نہ تھے، جب کہ عربوں کے عقل و فہم، تدبر اور تدبیر کی گواہی ہمیں تاریخ سے ملتی ہے۔ نیز جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا تو کیا محض کم عقل لوگ ایمان لائے تھے؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت سلمانؓ فارسی، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عبداللہؓ بن عمر اور حضرت ابوہریرہؓ اور ایسے دیگر صحابہ کے عقل و فہم پر کیا کسی کو کوئی شک ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں وحی اور عقل کی کوئی جنگ نہیں اور روح و مادہ کی کوئی تفریق ہے۔ دنیا سے اس کا حصہ لینے کی ممانعت نہیں اور نہ تعقلی کاوشوں پر پابندی ہے۔ مسلمانوں کی فلسفیانہ کاوشیں تو دراصل اس الحاد و کفر کی یلغار کے خلاف تھیں جو مختلف انداز سے اسلام کے اندر سرایت کر رہا تھا تاکہ اسے غیر عقلی اور بے دلیل مذہب ثابت کر سکے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سریانی زبان کے علما کی وساطت سے مسلمانوں نے جس یونانی فلسفے کے اثرات قبول یا رد کیے وہ سرے سے یونانی ہی نہ تھے اور یہی مسئلہ مسلم فلاسفی کا اساسی مسئلہ تھا۔

یونانیوں کے ہاں فلسفے کی جو شاخیں اہم تھیں ان میں طبیعیات، نفسیات، ریاضی، تاریخ فطرت، اخلاقیات اور مابعد الطبیعیات بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے اخلاقیات کے معاملے پر مسلمانوں کو سرے سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ان کے پاس مضبوط اخلاقی اساس پورے استدلال اور معروف فکر کے ساتھ موجود تھی۔ یونانی مابعد الطبیعیات کے پاس کوئی بنیاد موجود نہ تھی، محض تخیلاتی دائرے تھے جن کا مقابلہ عیسائی علم الکلام سے ہوا تو یہ فلسفہ نو افلاطونی اور نسطوری مکاتب الٰہیات کے روپ میں ضم ہو گیا۔ رہا طبیعیات، نفسیات، ریاضی اور تاریخ فطرت کا تعلق، تو مسلمانوں نے انھیں کبھی بھی اسلام کے مخالف نہ جانا اور نہ ان کی تحصیل کی راہ میں کبھی رکاوٹ پیدا کی، حتیٰ کہ معتزلہ کے سخت ترین مخالف امام غزالی نے بھی علم عقائد کے بعد دوسرا درجہ ان علوم کو دیا ہے جو طبعی اور تجربی

ثیت رکھتے ہیں۔

ایک مغالطہ یہ بھی ہے کہ امام غزالی نے فلسفے کی جڑیں کاٹیں اور تمام عقلی علوم کو یونانیت ملعونہ
نام دے کر انھیں ملیامیٹ کرنا شروع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ امام غزالی نے فلسفے کی نہیں بلکہ عیسائی
الکلام بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ علم الکلام کی جڑیں کاٹیں، جن کی ضرورت مسلمانوں کو نہ تھی۔ زیادہ وضاحت
ساتھ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ امام غزالی نے عقلیت پسند متکلمین کو ملیامیٹ کیا۔ لیکن یونانی تحقیقی علوم
ساکہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں مسلمانوں نے رد نہیں کیے بلکہ ان میں خاطر خواہ اضافہ کیا بلکہ بعض نئے علوم مثلاً
نیات، الجبرا مثلثات، علم الرجال، اصولِ تحقیق اور استخراجی منطق کے عمومی استعمال وغیرہ کا آغاز
۔ اس لیے یہ کہنا کہ امام غزالی کے اثر سے دنیائے اسلام فہم و دانش سے کلی طور پر محروم ہو گئی،
رہے۔ عظیم عباسی دور کے بعد ہمیں دربارِ غزنوی میں ابنِ سینا، البیرونی اور ابن الہیثم جیسے عظیم مفکرین
ہیں، اسی طرح اندلس کا عہد زریں ابنِ رشد اور ابنِ طفیل جیسے ماہرین سے مزین ملتا ہے مسلمانوں
ی و فکری زوال کسی حد تک احیاء علوم الدین کی غلط تاویلات و تشریحات کے ساتھ ساتھ بنیادی طور
ن کے سیاسی زوال کے باعث ہوا۔ تاتاریوں کے حملے، فرقہ پرستی، تعصبات اور طوائف الملوکی
، وجوہ ان کے علمی زوال کا سبب بھی بنیں۔

اب رہا یہ سوال کہ کیا فلسفے کی ضرورت باقی ہے؟ اور کیا اب بھی اسلامی فلسفہ نام کی کسی شے
ود برقرار ہے؟ پہلے سوال کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ فلسفہ کوئی آزادانہ حیثیت نہیں رکھتا بلکہ
ہبی احکام کی صداقت ثابت کرنے اور صوفیانہ واردات کی تشریح و توضیح کرنے کا وسیلہ بن کر اپنا
تام رکھتا ہے۔ اگر بات یہ ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلسفے کی آزاد ضرورت ہے بھی یا نہیں؟
ق سے الٰہیات، تصوف اور سائنس کا مطالعہ کریں۔ اگر فلسفہ بقول افلاطون عقلی طور پر تلاشِ حقیقت
ہے، تو الٰہیات اور تصوف کی تشریح اس کا فریضہ نہیں۔ اگر بقول ارسطو اصول و علل پر بحث کرنے
ہے، تو مذہبیت (اسنادِ پسند علم الکلام) تو فلاطونیت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کے
ات کے بخیے ادھیڑے جائیں۔ اور اگر رواقیوں کے بقول علم نیکی اور فضیلت کی دانش حاصل
نام فلسفہ ہے تو اسلام نے بنیادی طور پر اس کی تعلیم دے دی ہے۔ ان کی عقلی تشریح کرتے
[illegible] حاصل ہوجاتا ہے کہ کیا [illegible] کر کے [illegible] میں سے تھا۔

رہا یہ سوال کہ کیا اب بھی اسلامی فلسفہ نام کی کوئی شئے موجود ہے ؟ تو اس کا جواب تاریخ افکارِ اسلامی
عہدِ اول ہی سے دینا پڑے گا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے اور ہمارے ہاں اس کی تدریس بھی کی جا رہی
کہ شیعہ مسلم فکر میں پہلا اور قدیم ترین مکتبِ فکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیعہ بنیادی طور پر ایک سیاسی
رہے، اس کے اعتقادی افکار بہت دیر بعد لیکن غیر منظم حالت میں پیش ہوئے، لیکن آج تک شیعہ
ئی منظم فلسفہ پیش نہیں کر سکے۔ ان کی اعتقادی تعلیمات کا آغاز بھی دوسری صدی ہجری میں ہوا۔ یہی
ل خوارج کا ہے۔ انھوں نے شیعانِ علی اور معاویہ سے برأت کا اعلان کر کے ایک سیاسی فرقے کی ابتدا
۔ انھوں نے جمہوری حکومت کا نظریہ پیش کیا۔ علم الکلام کا آغاز معتزلہ ہی سے ہوتا ہے۔ جبریہ
رقدریہ بنیادی طور پر اعتقادی فرقے تھے۔ یہ صرف معتزلہ ہی تھے جنھوں نے سیاسی جھگڑوں سے بالاتر
و کر علم کے دامن میں پناہ لی۔ ان کی عقلیت پسندی کے ردِ عمل کے طور پر اشاعرہ سامنے آئے لیکن انھیں
نے اسناد کے ساتھ ساتھ تجسیم کا سہارا بھی لیا۔ چنانچہ ان دونوں کے بین بین مرجیہ آئے اور مرجیہ کے ردِ عمل
کے طور پر مشائین کا مکتبِ فکر سامنے آیا جس نے علم الکلام کو رد کر کے تجربی علم کا آغاز کیا۔ اخوان الصفا
س مکتبِ فکر میں اہمیت رکھتے ہیں۔ یوں یہ مکتبِ فکر الکندی سے شروع ہو کر ابن سینا، فارابی اور بغدادی
کے ہاتھوں پروان چڑھا۔

ایک طرف علمائے دین میں سلفیہ کا مکتبِ فکر دورِ جدید تک آیا اور دوسری طرف مشائین کا مکتبِ فکر جسے
ہم نا لص عقلیت پسند اور تجربی علوم کا حامل قرار دیتے ہیں: ابن مسکویہ، ابن خلدون اور دورِ جدید میں اس
کے سب سے بڑے مفکر علامہ اقبال ہمارے سامنے آتے ہیں۔ علامہ اقبال ایک ایسی شخصیت ہیں، جن کے
افکار میں بغدادی اور ابن سینا کی روایات اور سلفیہ کے حاصلات جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کی کتاب "تشکیل جدید الٰہیات
اسلامیہ" سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور یہ امام غزالی کی "احیاء علوم الدین" کی طرح مسلم تاریخ فکر
کی دوسری سب سے بڑی اور اہم کتاب ہے۔ اگر "احیاء علوم الدین" سے عقلیت پسندی کو نقصان پہنچا تو "تشکیل
جدید" ہمیں ایک ایسے مذہب کے احیاء کی طرف لے جاتی ہے جو قیاسی اور مفروضی نہیں بلکہ سراسر تجربی اور تعقلی ہے۔

دورِ جدید میں ہم اسلامی فلسفے کے مطالعہ کا شاہ ولی اللہ اور جمال الدین افغانی کے افکار سے آغاز کر کے سر سید،
شبلی نعمانی، ابو الکلام آزاد، سید امیر علی، علامہ اقبال اور مودودی کے افکار تک پہنچتے ہیں۔ دوسری طرف مصر میں
علامہ طنطاوی، احمد امین، ابو زہرہ مصری اور سید قطب شہید وغیرہ کے افکار قابلِ مطالعہ ہیں۔ ان میں علامہ اقبال
و علامہ طنطاوی جدید اسلامی فلسفے کی ہمہ جہتی بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے مطالعات کو عام کیا جائے۔